فقہ اور اُصولِ فقہ کی تدریس!

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
اُستاذ ونگران شعبہ تخصص فقہِ اسلامی جامعہ

مسالکِ اربعہ میں ائمہ کے اختلاف کے بنیادی اجتہادی اُصول

(تیسری اور آخری قسط)

اہم فائدہ

چلتے چلتے ایک لفظی تسامح کی نشاندہی کرتے چلیں کہ بعض حضرات فقہ اسلامی کی عصری تطبیق اور تصویرِ مسئلہ کی خارجی تمثیل کو جدید مسائل کا نام دیتے ہوئے خودرائی اور اجتہادِ جدید کی طرف لپکنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ اب تک جدید کہے جانے والے تقریباً تمام مسائل کا حل فقہی فروع یا اُصول وقواعد کی صورت میں ہی بتایا گیا ہے، اس بابت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل یا احکام نئے نہیں ہوتے، بلکہ ان کی صورتیں نئی ہوتی ہیں، فقہاء زمانہ کا کام ہوتا ہے جدید صورتوں کی قدیم فقہ کے ساتھ تطبیق کرنا، قدیم فقہاء کے اجتہادات کی بدولت فقہ ابداعی، تطبیقی اور تقدیری ہمارے سامنے آچکی ہے۔

ہمارا اجتہاد ان کے اجتہاد سے پائیدار نہیں ہوسکتا، اس لیے بلاوجہ فقہ قدیم سے جدید مسائل کے نام پر عدول کرنا نامعقول امر ہے۔ ہاں! اگر ایسی صورت پیش آجائے جس کا فقہ قدیم کے ذخیرہ میں نصاً، اصولاً، فرعاً، اثباتاً یا نفیاً کوئی حل نہ ملتا ہو تو اس کے حل کے لیے فقہاء امت کے وضع کردہ اُصولوں کی روشنی میں متدین ومتعبد علماء کی مجلسِ مشاورت منعقد کی جائے گی اور وہ مجلس ایسی مشکلات میں اُمت کی دینی رہنمائی کرے گی۔ ایسے مسائل ان کے حل کے لیے رہنما اصول اور اجتہاد کے اصول وشرائط سے متعلق حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے چندگراں قدر مقالات جو فتاویٰ بینات کے شروع میں مقدمہ کے طور پر شامل ہیں، ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض جدت پسندوں کو یہ بھی خبط ہوتا ہے کہ قدیم فقہ فقہاء کے اپنے زمانے کے احوال و مسائل کے حل کے لیے اجتہادی کوششیں تھیں، اب زمانہ بدل گیا ہے، زمانے کے حالات تبدیل ہوچکے ہیں، لہٰذا پرانی فقہ اس زمانے کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتی، بلکہ اس میں تبدیلی ناگزیر ہے، اس فکر کو خبط

کہنا ہی کافی ہے، کیونکہ اس فکر کے حامل لوگ فقہ کی حقیقت سے ناواقف ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقہی احکام چار قسم کے ہوتے ہیں:

۱:- احکامِ منصوصہ اتفاقیہ　　　۲:- احکامِ اجتہادیہ اتفاقیہ

۳:- احکامِ اجتہادیہ خلافیہ　　　۴:- احکامِ جدیدہ غیر مصرحہ نفیاً واثباتاً

پہلی دو قسموں میں زمانہ کی تبدیلی کا کوئی بھی اثر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ تیسری قسم میں قدیم مجتہدین کے اجتہاد سے باہر نکلنے کی حاجت ہے، نہ اجازت ہے۔ اگر اجتہاد ہوسکتا ہے تو چوتھی قسم میں ہوگا، اس کی ضرورت کا کسی کو انکار نہیں۔ اسی طرح وہ مسائلِ اجتہادیہ عرفیہ جن کی بنا عرف وعادت پر رکھی گئی تھی، ایسے مسائل میں تغیرِ زمانہ کی وجہ سے تغیرِ حکم کی حقیقت قابلِ تسلیم ہے، ایسے مسائل میں از سرِ نو غور وفکر ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، مگر اس آخری قسم کے اجتہاد کی ضرورت باور کرانے کے ساتھ ساتھ مجتہدین کی اہلیت اور مطلوبہ شرائط کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ معاملہ ہو دین کا اور اجتہاد کی اجازت دین بیزار مانگ رہا ہو تو اسے خبط کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟!

بہرکیف! حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ایسے قابلِ اجتہاد مسائل کے حل کے لیے انفرادی وشخصی کاوشوں کی بجائے ''لجنة الاجتهاد'' قائم کی جائے، جس کے ارکان میں کم از کم یہ پانچ اوصاف بدرجۂ تمام پائے جاتے ہوں:

۱:- اخلاص　　۲:- تقویٰ　　۳:- قرآن وسنت وفقہِ اسلامی میں مہارت ووسعت

۴:- دقتِ نظر وذکاوت　　۵:- جدید مشکلات کے سمجھنے کی اہلیت

جسے اجتہادِ جدید کا شوق ہو یا وہ اُمت کا درد رکھتا ہو تو ان شرائط سے آراستہ ہوکر ''لجنة الاجتهاد'' کا رکن بنے، اور چوتھی قسم کے مسائلِ جدیدہ کے حل میں ضرور مساہمت اختیار کرے۔ اگر اجتہادِ جدید کا کوئی شائق اس سے آگے لپکنے کی کوشش کرے گا تو اسے دین کے ساتھ مزاحمت سمجھا جائے گا، اور اس کی مزاحمت کرنا علماء دین کا فریضہ شمار ہوگا۔

فقہی احکام کی بناء علتوں پر ہوتی ہے، حکمتوں پر نہیں، مگر کسی نہ کسی حد تک حکمتوں پر نظر ہونا بھی ضروری ہے، مثلاً: قیاسِ شرعی اور استحسان کے تقابل کی صورت میں علتِ جامعہ کا تقاضا یہ ہوگا کہ قیاس کی رعایت کی جائے، مگر حکمت ومصلحت، متقاضی ہوگی کہ قیاسِ ظاہر سے عدول کرلیا جائے، حکمت کی اسی رعایت اور ترجیح کا دوسرا نام استحسان ہے۔ استحسان فقہاء کے ہاں فقہ کا ذیلی ماخذ بھی شمار ہوتا ہے، بظاہر اصل ماخذ کے مقابلے میں ذیلی ماخذ کی طرف التفات' قوی کے مقابلے میں ضعیف کی طرف التفات ہے، مگر حکمت ومصلحت اس کی مرجح بنتی ہے۔ اس حکمت کی رعایت بھی فقہاء کے ہاں اصل کا

درجہ رکھتی ہے، اس لیے فقہی مدرسین کو اپنے مطالعہ کے دوران فقہی احکام کے ماخذ، اصول اور علتوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ حکمتوں پر اطلاع کی کوشش بھی کرنی چاہیے، اس موضوع پر سب سے عمدہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ''**الموافقات**'' کا ''**جزء المقاصد**'' بھی مفید ہے۔

اسی طرح حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''**المصالح العقلية في الأحكام الشرعية**'' (احکامِ اسلام عقل کی نظر میں) بھی قابلِ استفادہ کتاب ہے، ان کتابوں کے مطالعہ میں رہنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمیں اور ہمارے طالب علم کو شرعی احکام کی معقولیت کا ادراک ہوگا، اور عقل پرست طبقے کے زیغ وضلال سے محفوظ رہ سکیں گے۔

تدریسِ اصولِ فقہ

اس موضوع پر تین جہات سے بات ہوگی:

۱:-تمہید وتوطیہ ۲:-توضیح وتطبیق ۳:-تفریع وتذییل

تمہید

اس عنوان کے تحت اُصولِ فقہ کے مبادیات کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے گا، جس میں اصولِ فقہ کا تعارف، تدوین، تاریخ، تقسیم وتنویع اور اس فن کے وہ متعلقات جو عموماً درسیات سے دور رہتے ہیں۔ تمہید کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ مقصود وممہّد سے زیادہ طویل نہ ہو، مختصر ہی بتایا جائے۔

تعارف

اُصولِ فقہ کی تعریف کی متعدد تعبیرات میں سے آسان تعبیر یہ ہے کہ یہ علم فقہ تک رسائی دینے والے قواعد کی پہچان کا نام ہے۔ شرعی دلائل سے فقہی احکام کے استنباط واستخراج کا ملکہ فراہم کرنے والے قواعد کو اُصولِ فقہ کہا جاتا ہے۔ (کشاف اصطلاحات الفنون، ج:۱،ص:۲۸، ط:سہیل اکیڈمی لاہور)

اصل کا معنی دلیل، مرجع اور قاعدہ سے بھی کیا جاتا ہے۔ ان تمام اُمور کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُصولِ فقہ ان بنیادوں کا نام ہے جن پر فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، یا ان قواعد و طرق کا نام ہے جن کے ذریعہ دلائل شرعیہ سے فقہی مسائل کا استنباط واستخراج ہوا ہے۔

فقہی مسائل کے استنباط واستخراج کے اس عمل کے بارے میں اطلاع پانے سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ فقہاء امت نے فقہی مسائل کو جس دقتِ نظری اور نکتہ رسی سے مرتب کیا ہے، یہ ان کا احسانِ عظیم ہے، اور یہ کہ ان کی مشقتوں کو دیکھ کر فقہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جائے، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ اگر

کوئی اجتہادی شان کا حامل ہو اور وہ دلائل سے مسائل کا استنباط کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ راستہ متعین ہے، مجتہد زمانہ کم از کم سابقہ مجتہدین کے اجتہادات کی بنیادوں سے شروع ہوکر چوٹیوں تک پہنچنے کی کوشش کرے، پھر اگر سابقہ اجتہادات پر اضافہ کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو وہ اپنی خدمات پیش کرے، اُمت اسے بھی اعتماد سے نوازے گی۔

اُصولِ فقہ کی تاریخ

اُصولِ فقہ جب ان بنیادوں کا نام ہے جن پر فقہی احکام کی تخریج ہوئی ہے۔ تو اس تعریف سے یہ فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ اُصولِ فقہ کی تاریخ فقہ سے مقدم ہے، جس دور سے فقہ کی تاریخ بتائی جائے گی اس سے کچھ پہلے یا کم از کم اس کے ساتھ ہی اُصولِ فقہ کا آغاز بھی ماننا اور بتانا پڑے گا۔ فقہ کا وجود اُصولِ فقہ کے وجود کو مستلزم ہے۔

چنانچہ فقہ اسلامی کی تاریخی تشکیل سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کا وجود اور آغاز خود صاحبِ شریعت ﷺ کے دور سے چلا آرہا ہے۔ اس وقت اُصولِ فقہ کی صورت کیا تھی؟ اُصولِ فقہ کے مفہوم سے بے خبر کے لیے یہ سوال بڑا اہم ہے، مگر اُصولِ فقہ کا مفہوم جاننے والوں کے لیے کوئی بھاری نہیں ہے، کیونکہ وہ دور' شریعت کے نزول کا دور تھا، کسی بھی موقع اور مسئلہ میں بیانِ حکم کے لیے دو اصول کے ذریعہ حکم دریافت کرنا آپ ﷺ کا معمول تھا: ایک بذریعہ وحی، دوسرا بذریعہ اجتہاد۔

آپ ﷺ کے دورِ اطہر میں جو جو مسائل پیش آئے ان کا حل آپ ﷺ نے ان ہی دو ذریعوں سے پیش فرمایا، گویا آپ ﷺ کے زمانے میں علمی احکام (فقہی مسائل) کے اخذ و اظہار کے یہ دو اصول تھے، انہیں زمانۂ نبوت کے فقہی اصول سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اجتہاد کا راستہ باقی رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی اجتہادی اصول کے ذریعہ منصوص مسائل کی روشنی میں غیرمنصوص مسائل کا استنباط و استنتاج فرمایا اور آگے چل کر اس سنت کو اپناتے ہوئے ائمہ مجتہدین نے سلسلۂ اجتہاد کو ضرورتِ مسائل کی بنیاد پر وسعت دی اور اس میدان میں نمایاں نام و مقام امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا۔ اس لیے انہوں نے منصوص سے غیرمنصوص کے استنباط و استنتاج کے اصول و فروع متعارف کرائے، پھر ان کی عیال داری میں یہ سلسلہ دینِ اسلام کی چارگانہ تعبیر بن گیا، بایں معنی اصطلاحی و عرفی فقہ اور اصول فقہ کے بانی و مدونِ اول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔ (ابوالوفاء الافغانی، مقدمہ اصول السرخسی، ج:۱، ص:۳، دارالکتب العلمیۃ) پھر آپ کی تبعیت میں امام ابویوسف یعقوبؒ، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں سے کسی کے بارے میں اولیت کا قول کیا جائے تو امرِ اضافی کے طور پر وہ بھی درست

ہے، البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ’’الرسالۃ‘‘ کو اُصولِ فقہ کی کتاب قرار دینے کی صورت میں انہیں اُصولِ فقہ کی تدوین کی بجائے متداول تالیف میں اسبقیت کا اعزاز حاصل رہے گا۔ تدوینِ اُصولِ فقہ کے موضوع پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ’’تدوینِ فقہ و اُصولِ فقہ‘‘ بہترین ذخیرہ ہے۔

اُصولِ فقہ کے مناہج اور اہم کتبِ مناہج

● اُصولِ فقہ پر باقاعدہ منظم منہجی طریقے سے جو کام ہوا وہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی ہجری میں ہوا، اس کے بعد کا جو کام ہے وہ تقریباً تعبیرِ جدید وتفنّن فی العبارۃ یا جمع فی الطرق کا درجہ رکھتا ہے، ان ادوار میں اُصولِ فقہ کی تدوین کے تین مناہج متعارف ہوئے:

۱:- منہج المتکلمین / الشافعیہ ۲:- منہج الفقہاء/ الحنفیۃ

۳:- منہج المتاخرین الجامع بین الطریقین

● متکلمین کے طریق کو شافعیہ و مالکیہ کا طریق بھی کہا جاتا ہے، اس طبقہ والے صرف قواعد ذکر کرتے ہیں، قواعد کا دائرہ کار اور دلائل تک جاتے ہیں، جزئیات کی تطبیق کا التزام نہیں کرتے، جیسے امام الحرمین جوینیؒ کی ’’البرهان فی أصول الفقه‘‘ (عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف بن محمد الجوینی الملقب بامام الحرمین [۴۱۹ھ-۴۷۸ھ]) اور امام غزالیؒ کی ’’المستصفیٰ‘‘ (ابوحامد محمد بن محمد الغزالی الطّوسیؒ) وغیرہ۔ قاضی عبدالجبار المعتزلی کی ’’العمد‘‘، ابوالحسین بصری معتزلی کی ’’المعتمد‘‘ (المعتمد فی أصول الفقه ، محمد بن علی الطیب ابوالحسین البصری المعتزلی [متوفی: ۴۳۶ھ]) بھی اسی منہج کی کتابیں شمار ہوتی ہیں، پھر ان کتابوں کے اسالیب کو امام رازیؒ [متوفی: ۶۰۶ھ] نے ’’المحصول فی علم الأصول‘‘ میں اور علامہ آمدیؒ نے ’’الإحکام فی أصول الأحکام‘‘ (ابوالحسن سیدالدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الثعلبی الآمدی [متوفی: ۶۳۱ھ]) میں جمع فرمایا ہے۔

● فقہائے حنفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے اجتہادی مسائل کو سامنے رکھ کر اُصول وقواعد مرتب کرتے ہیں، قواعد کے ساتھ ہی تفریع کے لیے جزئیات ذکر کرتے ہیں، جس سے حنفی اُصولِ فقہ، اصول و جزئیات میں ارتباط اور تطبیق کا مظہر بن جاتی ہے، اور محض نظری کی بجائے تطبیقی اُصولِ فقہ بن جاتی ہے۔

حنفی طریق پر تالیف شدہ کتابوں میں دبوسی کی ’’تقویم الأدلة‘‘ (تقویم الأدلة فی أصول الفقه ، ابوزید عبیداللہ بن عمر بن عیسی الدبوسی الحنفی [متوفی: ۴۳۰ھ]) اور ’’تاسیس النظر‘‘ معروف ہیں، اس کے علاوہ ابومنصور ماتریدیؒ کی ’’ماخذ الشریعة‘‘ اسی دور کی تالیف ہے۔

اس فن کی سب سے عمدہ کتاب امام ابوبکر جصاص کی ’’الفصول فی الأصول‘‘ (احمد بن علی

ابوبکر الرازی الجصاص الحنفی [متوفی: ۳۷۰ھ] ہے، أصول البزدوي (للامام فخر الاسلام ابی الحسن علی بن محمد بن حسین البزدوی [۴۰۰-۴۸۲ھ]) اور أصول السرخسي بھی ہے۔ أصول البزدوي کی جامع شرح ''کشف الأسرار'' للعلامہ عبدالعزالبخاری ہے (کشف الأسرار شرح أصول البزدوي، عبدالعزیز بن احمد بن محمد علاء الدین البخاری الحنفی [متوفی: ۷۳۰ھ])، اُصولِ سرخسی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی سنت کی بحث حنفی اُصولِ حدیث کی جامع تقریر کا درجہ رکھتی ہے۔

● منہج المتاخرین جو جامع بین الطریقین کہلاتا ہے، اس طرز پر امام احمد بن علی البغدادی الحنفی الشہیر بابن ساعاتی [متوفی: ۶۹۴ھ] کی ''بدیع النظام الجامع بین کتابی البزدوي والإحکام''، صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود کی ''تنقیح الأصول'' اور اسی کی شرح ''التوضیح فی حل غوامض التنقیح'' اسی پر تفتازانی کا حاشیہ ہے: ''التلویح'' کے نام سے، یہی مجموعہ درسِ نظامی کا حصہ ہے'' شرح التلویح علی التوضیح لمتن التنقیح'' کے نام سے۔ اسی طرح علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی [متوفی: ۷۷۱ھ] ''جمع الجوامع'' ہے، ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ [متوفی: ۸۶۱ھ] کی ''التحریر فی أصول الفقہ'' ہے، جس کی شرح ابن امیر حاج [متوفی: ۸۷۹ھ] نے ''التقریر والتحبیر فی شرح کتاب التحریر'' کے نام سے لکھی، علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں ''التحریر'' اور ''التقریر'' کا تذکرہ بڑی اہمیت کے ساتھ ملتا ہے۔ ''مسلم الثبوت'' (محبّ اللہ بن عبدالشکور البھاری الہندی) بھی اسی ڈگر کی کتاب ہے، جس میں علامہ سبکی اور محقق ابن ہمام رحمہما اللہ کے ذکر کردہ اصولی مباحث کی تلخیص اور ترتیب نو فرمائی گئی ہے، ''فواتح الرحموت'' (عبدالعلی محمد بن نظام الدین الانصاری الہندی) کے نام سے اس کی معروف شرح ہے، اور ''مسلم الثبوت'' کے ہیبت ناک رعب و رھب کو آسانی سے دور کرنے کے لیے ایک آسان ترین شرح ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد انور البدخشانی مدظلہم نے ''إزالۃ الرھبوت عن مشکلات مسلم الثبوت'' کے نام سے لکھی ہے۔

اسی موضوع پر محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ الشوکانی رحمۃ اللہ علیہ [متوفی: ۱۲۵۰ھ] نے ''إرشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول'' کے نام سے کتاب لکھی، نواب صدیق حسن خانؒ [متوفی: ۱۳۰۷ھ] نے ''حصول المأمول من علم الأصول'' کے نام سے علامہ شوکانیؒ کی کتاب کی تلخیص کی ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب کے حوالہ جات علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں اور دیگر کئی باحثین کی ابحاث میں ملتے ہیں، گویا کہ اس کتاب سے ہمارے ہاں خوب استفادہ کیا گیا ہے، البتہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص مزاج ہے، اور اس گہرے موضوع میں کہیں کہیں وہ اپنی روایتی ظاہر بینی کا

اظہار فرماجاتے ہیں، مگر مجموعی لحاظ سے یہ کتاب اصولی مباحث کا مکمل احاطہ کرتی ہے، فقہاء کے اختلاف کو کما حقہ نقل کرتی ہے، عبارت وتعبیرات عام فہم، سادہ، مختصراور واضح ہیں، اس موضوع کی دیگر کتب کی طرح تعقیدات واغلاقات سے پاک ہے۔ علامہ کے خاص مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کتاب متاخرین اصولیین کے منہج کو سمجھنے کے لیے کافی شافی ہے۔

اُصولِ فقہ کے مباحثِ خمسہ

اُصولِ فقہ کے مباحث کو حصر اور ضبط میں لانے کے لیے پانچ بنیادی مباحث اور ان مباحث کے مدلولات سے قدرے واقفیت بھی ہونی چاہیے، ان مباحث کی طرف فقہ کے تعارف میں بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، وہ مباحث یہ ہیں:

۱:- حاکم ۲:- حکم ۳:- ادلۃ الاحکام ۴:- مقاصد ومدارجِ احکام ۵:- دلالۃ الکلام

حاکم

حاکم کا مطلب حکم دینے کی اتھارٹی یا تحلیل وتحریم کا فیصلہ کرنے کا مختار ومجاز کون ہے؟ یہ مسئلہ فقہ سے زیادہ علم کلام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ ’’أَلَا لَہُ الْحُکْمُ‘‘ (الانعام:۶۲) ’’إِنِ الْحُکْمُ إِلَّا لِلّٰہِ‘‘ (یوسف:۶۷) یعنی کسی فعل کا حکم متعین کرنا اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے، کسی اور ہستی یا عقل کا اس میں کوئی دخل نہیں مانا جاسکتا۔ شرعی احکام میں عقل کو حکم/ حاکم سمجھنے والے طبقے کا تعلق اہلِ اعتزال سے تو ہوسکتا ہے، مگر اہلِ سنت سے نہیں ہوسکتا۔ اُصولِ فقہ کے باحثین اور مدرسین کو دورانِ درس یا قبل از درس اس بحث کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ گمراہی کی بیشتر نالیاں عقل پرستی کے بحرِ مردار سے ہی نکلتی ہیں۔

حکم

حکم کی حیثیت کیا ہے؟ متعلقہ وصف کے ذریعہ اس کی نشاندہی کی جائے، یعنی فرض، واجب، سنت، حلال، حرام، مباح ومکروہ، جائز وناجائز وغیرہ جو حکم کے القاب ہیں، ان سے واقفیت ہونی چاہیے، کیونکہ مطلق امر وجوب سے لے کر اباحت تک مختلف مطالبات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح نہی کا صیغہ حرام سے لے کر مکروہِ تنزیہی تک استعمال ہوتا ہے۔ جن فقہی احکام کے ہم اُصول پڑھنے جارہے ہیں، ان اُصول میں احکام کی یہ تفصیل اگر صحیح طور پر نہ سمجھی جائے تو کسی مسئلہ کا حکم متعین کرنے میں غلطی سے حفاظت نہیں ہوسکے گی، اگر چہ یہ کام افتاء کے دائرے میں آتا ہے، مگر افتاء کے لیے فقہ اور اُصولِ فقہ سے مکمل واقفیت ضروری ہے، اس ضمن میں اُصولِ فقہ کے طلبہ کو یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ مسائل کے احکام کا بیان اور ان کی درجہ بندی کا تعین اس اُصولی عالم کا کام ہے جو اُصول میں

کمال و مہارت کے بعد افتاء کے منصب سے عملاً وابستہ ہو، یہ ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

ادلۃ الاحکام

ادلۃ الاحکام، ادلۂ شرعیہ یا ادلۂ تفصیلیہ سے مراد وہ مآخذ ہیں جہاں سے فقہاء مجتہدین نے فقہی واجتہادی مسائل اخذ فرمائے ہیں یا وہ طرق ہیں جن طرق سے فقہی فروعات حاصل کی گئی ہیں، ایسے مآخذ، بنیادیں اور طرق دو قسم کے ہیں:

۱:- اصلی/ اتفاقی مآخذ ۲:- ذیلی/ اختلافی مآخذ

مآخذِ اصلیہ اتفاقیہ چار ہیں:

۱:- کتاب اللہ ۲:- سنت رسول اللہ (ﷺ) ۳:- اجماع ۴:- قیاس

مآخذِ فرعیہ اختلافیہ آٹھ ہیں:

۱:- قولِ صحابی ۲:- شرائع من قبلنا ۳:- استحسان ۴:- مصالحِ مرسلہ
۵:- سدِ ذرائع ۶:- استصحابِ حال ۷:- عرف وعادت ۸:- تعاملِ اخیار

ان میں سے بعض حنفیہ کے ہاں حجت ہیں، دیگر ائمہ اس کا انکار فرماتے ہیں، بعض دیگر کے ہاں معتبر ہیں اور حنفیہ کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے۔ ان مآخذ کے تعارف پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، شیخ ابو زہرہ مصری رحمہ اللہ نے ائمہ مجتہدین کے تعارفی سلسلوں میں ''**الأصول التی بنی علیها الإمام ...... فقهه**'' کے مستقل عنوان کے تحت اس موضوع کی تنقیح وتہذیب فرمائی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اجمالی طور پر اپنے طالب علم کو یہ بتائیں کہ فقہی مآخذ کی فہرست کیا ہے، اور ہماری درسی کتاب میں اس ماخذ کے مکمل تعارف سے کہاں کہاں تعرض کیا گیا ہے، اور کہاں کہاں رہ گیا ہے، مثلاً: اصول الشاشی میں زیادہ تر حصہ اُصولِ فقہ کی صرف ایک بحث ''**دلالة الکلام**'' کے گرد گھومتا ہے، مآخذ میں سے صرف ادلہ اربعہ اتفاقیہ سے بحث ہے، یہ کتاب اُصولِ فقہ کے سارے مباحث کو جامع نہیں ہے، جو طالب علم صرف روایتی درسیات پڑھ کر اُصولِ فقہ کو اول آخر اُصول سمجھ کر فارغ ہوگا، یقیناً وہ اُصولِ فقہ سے متعلق ناقص خیال کا حامل ہی کہلائے گا، اس لیے مآخذ کا قدرے تعارف' مبادیات کے درس کے طور پر ہونا چاہیے، یا ان ذیلی مآخذ سے متعلق درسی کتاب میں جہاں اشارہ یا اجمالی تذکرہ ملتا ہے، وہاں پر قدرے تفصیلی گفتگو کرنی چاہیے۔

مقاصدِ شریعت ومدارجِ احکام

احکامِ شرعیہ کے مقاصد، حِکَم، اسرار وعلل عقلیہ کیا ہیں؟ یہ بھی اُصولِ فقہ کے مباحث میں

شامل ہے، مگر ہماری درسی کتب میں اس طرف رہنمائی بڑی دیر سے مخصوص لوگوں کو تخصصات میں نصیب ہوتو ہو، اس سے قبل نظر نہیں آتی، تخصصات میں جہاں ''**الموافقات للشاطبیؒ**''، ''**حجة اللّٰه البالغة**'' اور ''**الأشباه والنظائر**'' پڑھائی جاتی ہیں، وہاں یہ بحث سامنے آتی ہے، ورنہ عام طلبہ کی نظروں سے یہ بحث اوجھل رہتی ہے، پس اختصار کے ساتھ اتنا بتایا جائے کہ احکامِ شرعیہ کے عمومی مقاصد پانچ ہیں:

۱:- حفظِ دین ۲:- حفظِ نفس ۳:- حفظِ نسل ۴:- حفظِ مال ۵:- حفظِ عقل

(الموافقات فی اصول الشریعۃ لابراہیم بن موسی الغرناطی الشاطبی [متوفی: ۷۹۰ھ]، کتاب المقاصد، النوع الاول فی بیان قصد الشارع فی وضع الشریعۃ، ج:۱، ص:۸، دار الکتب العلمیۃ)

ان مقاصد کو فقہی کتابوں میں چار بڑے عناوین کے تحت منقسم احکام کے ضمن میں پھیلایا گیا ہے، یعنی عبادات، مناکحات ومعاشرت، معاملات اور خصومات وغیرہ، ان مقاصدِ خمسہ کو بنیادی انسانی حقوق بھی کہا جاتا ہے، اور فلسفۂ حیات سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، ان اُمور کی توضیح وتنویع سے بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ حیاتِ انسانی کا حقیقی فلسفہ اور حقوقِ انسانی کی محیط نگرانی کا ضابطہ صرف اور صرف اسلام میں ہے اور جو لوگ دنیا میں انسانی حقوق کے دعویدار اور علمبردار بنے ہوئے ہیں وہ انسانی حقوق کے نام پر حق تلفیوں کے مرتکب ہور ہے ہیں۔ غرض یہ کہ جو امر ان مقاصدِ خمسہ میں سے ایک یا چند کے تحفظ میں معاون ومحرک بنتا ہوا اُسے حکمت ومصلحت کہا جائے گا، اور ایسی حکمت ومصلحت کا اثر شرعی حکم کے لیے قابلِ اعتبار مانا جائے گا۔

جب کسی چیز پر کسی کا استحقاق مانا جائے تو اس کا درجہ کیا ہے؟ جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہ رہے ہیں، اس چیز کے حصول یا ادائیگی میں کوئی حد بندی اور درجہ بندی بھی ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامیہ کسی حق کو تسلیم کرتے ہوئے اور صاحبِ حق کے لیے حق ثابت کرتے ہوئے احکامِ شرعیہ کے حوالے سے درجہ بندی کی قائل ہے، جس طرح احکام میں فرض، واجب اور حرام ومکروہ وغیرہ کی درجہ بندی ہے، اسی طرح احکام کے اثبات اور حقوق کے تسلیم کرنے کے لیے بھی درجہ بندی ہے، اس کو مدارجِ احکام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب کوئی انسان کسی چیز کو اپنا حق قرار دے کر اس کے حصول کے درپے ہو تو سب سے پہلے اس حق کی جائز اور ناجائز کے اعتبار سے تشخیص ضروری ہوتی ہے، پھر اگر جائز قرار پائے تو پھر اس میں تفصیل ہے کہ ہر جائز ومباح پر انسان کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر تسلیم کیا جائے تو کس حیثیت

میں؟ فقہائے کرام نے ان باریکیوں اور گہرائیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بندوں کے استحقاق سے متعلق احکام کی درجہ بندی کی وضاحت فرمائی ہے، یعنی جس چیز کو آپ حق سمجھ کر حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ آپ کے لیے ضرورت کے درجہ میں ہے، حاجت کے مرتبے میں ہے، تحسین کے رتبے میں ہے، تعیُّش کے احاطے میں ہے یا فضول کے دائرے میں ہے؟ انسان کے ہاں قابلِ استحقاق چیزوں کی اسی تقسیم کو اُصولیین ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول سے بھی تعبیر کیا کرتے ہیں۔

شرعی احکام کے لیے وضع کردہ یہ مدارج فی زمانہ اصولی فقیہ کے پیشِ نظر ہونا انتہائی ضروری ہیں، اس لیے کہ مغربی معاشیین نے ضروریات وتعیُّشات کو خلط ملط کر کے مغربی معاشی نظام کو زبردست ہوّا بنادیا ہے اور ہر خواہش کی تکمیل کو ضرورت باور کرایا جاتا ہے، پھر ہمارے بعض اسلامی معاشیین جب فقہ المعاملات کے راستہ سے مغربی معاشی نظام کا جائزہ لینے جاتے ہیں تو جس تعیُّش اور آسائش کو مغرب نے ''ضرورت'' کہہ کر جواز اور رواج بخشا ہوتا ہے، یہ اسلام کار لوگ بھی اُسے ''ضرورت'' کہہ کر سندِ اسلام دینے بیٹھ جاتے ہیں اور مغرب کی پھیلائی ہوئی معاشی صورتوں پر اسلامی لیبل لگا کر اسلامی معیشت کے قیام ونفاذ کے شادیانے بجانے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مغرب کے ''نظریۂ ضرورت'' اور اسلامی ''قاعدۂ ضرورت'' کے درمیان لفظی قربت کے باوجود زمین وآسمان کا فرق ہے۔

ہمیں چاہیے کہ انسان کے بنیادی حقوق، احکامِ شرعیہ کے مقاصدِ خمسہ اور مدارجِ احکام کے مراتبِ خمسہ کے بارے میں دورانِ درس کچھ نہ کچھ معلومات اپنے اُصولی طالب علم کو دینے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر بظاہر اُصولِ فقہ کی ابحاث ادھوری رہ جاتی ہیں۔

دلالۃُ الکلام

اُصولِ فقہ کے مباحث میں پانچویں بحث ''**دلالۃ الکلام**'' ہے۔ ''**دلالۃ الکلام**'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے فقہی مآخذ بالخصوص قرآن وسنت کی زبان عربی ہے۔ عربی تعبیرات، گفتگو کے اسالیب اور کلمات کے مقاصد اور محاورات سے واقفیت لازمی ہے، اس کے بغیر فقہی احکام کے مدلول ومصداق کا تعیُّن مشکل ہوتا ہے، مثلاً: ''کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا'' بھی امر ہے اور ''أَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوْا الزَّکٰوۃَ'' بھی امر ہے، ''فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ'' میں ایمان اور کفر دونوں کے لیے صیغۂ امر لایا گیا ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ صیغۂ امر کب اور کہاں کس معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ اگر امر کو صرف وجوب کی دلالت کے لیے مانا جائے تو اس سے بہتیرے شرعی احکام میں خلل آئے گا۔

اسی طرح حرف کی بحث میں ''واؤ''، ''فاء'' اور ''باء'' وغیرہ جب کسی حکم کے ساتھ ہوں تو

وہاں ان حروف کے استعمالات کا مکمل ادراک لازمی ہے، جو ''واو'' کے استعمالات سے واقف ہوگا وہی یہ سمجھ سکے گا کہ ''واو'' جمع کے لیے ہے یا ترتیب کے لیے ہے، وغیرہ وغیرہ، اسی طرح ''فاء'' تفریع کے لیے ہے، عطف کے لیے ہے یا جزا کے لیے ہے۔ اُصولِ بزدوی واُصولِ سرخسی میں اُصولِ فقہ کی اس بحث کو اہمیت کے ساتھ ابتدائی ابحاث میں جگہ دی گئی ہے۔ (اُصول البزدوی، باب الامر، ص:۱۹، ط: نور محمد)

اس لیے اُصولِ فقہ کے اساتذہ درس کے دوران عربی زبان کے دلالتی پہلو کو بطورِ خاص اہمیت دیں، ہماری کوشش یہ رہنی چاہیے کہ ہم اُصولِ فقہ سمجھنے اور سمجھانے کے ساتھ خود اُصولِ فقہ کو بھی تمام مباحث کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

توضیح وتطبیق

تمہیدی گفتگو کے بعد اب اُصولِ فقہ کی تدریس کے توضیحی پہلو کی طرف آتے ہیں، یعنی اُصولِ فقہ کی جو کتاب شاملِ درس ہے، اس کتاب کے مندرجات کی تفہیم کے لیے مدرس کو کیا کرنا چاہیے؟ اور یہی ہمارا بنیادی مقصد ہے، اور اس کو درج ذیل امور کا التزام کرنا پڑے گا:

۱:...... سبق کی تیاری..... یہ عمل ہر کتاب کے لیے کرنا ہوتا ہے، جیسے فقہ کی تیاری، مطالعہ اور ضبط کی ترتیب عرض کی گئی ہے، یہ عمومی ہدایت ہے۔ تیاری کے سلسلہ میں استاذ اور طالب علم دونوں کو تیاری کرکے آنے کی ضرورت ہے، جس کا اوپر بیان گزر چکا ہے۔

۲:...... طالب علم کو عبارت فہمی کی عادت ڈالنے کی محنت کرنا، عبارت فہمی کے لیے صحیح عبارت خوانی ضروری ہے اور صحیح عبارت خوانی کے لیے تلفُّظ، ادائیگی، اعراب کی درستگی اور جملوں کی ابتدا وانتہا کا علم ہونا ضروری ہے، اس مقصد کے لیے موقع بموقع صرف ونحو سے استمداد اور تذکار ضروری ہوتا ہے۔

۳:...... عبارت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم طالب علم سے کہلوایا جائے، شروع شروع میں یہ مشق زیادہ کی جائے، تاکہ طالب علم عادی ہونا شروع ہوجائیں۔

۴:...... طالب علم کی دلچسپی حاصل کرنے اور استعداد کو بیدار کرنے کے لیے قدیم طرز پر طالب علم سے آمدہ سبق کی تیاری کرکے استاذ کے گھنٹے میں طلبہ کے سامنے سبق پیش کرنے کی محنت بھی کرائی جائے، پھر طالب علم کے فہم میں جو کمی رہ گئی ہو اُستاذ اس کی نشاندہی کرکے کمی دور کرنے کی کوشش کرے، اور آخر میں سبق کا خلاصہ ''آمادگی'' کے انداز میں استاذ طلبہ کے سامنے پیش کرے۔

۵:...... درس کی مقدار میں توازن کا لحاظ بہت ضروری ہے، مبادیات کے طور پر ذکر کردہ مباحث یا تحلیلِ عبارت سے متعلق مشقی فوائد کا یہ مطلب قطعاً نہیں لینا چاہیے کہ شروع شروع میں ہم کتاب سے خارج مباحث پر پوری توانائی صرف کریں اور کتاب کے مندرجات کی نوبت آنے پر محض

نصاب پورا کرنے کی فکر میں سبک رفتاری کا شکار ہو جائیں، اس کمزوری سے بچنے کے لیے کم از کم تین اُمور کا التزام مفید ہوگا:

الف: مدرس نے سبق کی تیاری کے دوران تفہیم کے لیے اور تسہیل کے لیے جو درس کا خاکہ بنایا ہے، درسی تقریر کو اسی تک محدود رکھنے کی کوشش کرے۔

ب: مقررہ نصاب کے صفحات یا مباحث کا اندازہ لگا کر یومیہ درس کی مقدارِ خواندگی طے کر لی جائے، مثلاً: آدھا صفحہ، پورا صفحہ یا دو صفحے وغیرہ طے کر لیے جائیں، اگر آج ہدف پورا نہیں ہو رہا تو اگلے دن یا دنوں میں اس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ج: یہ سب کچھ مکمل حاضری کی صورت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے، یعنی گھنٹے اور مہینے کی حاضری دونوں مکمل رکھی جائیں۔

۶:......حنفی اُصولِ فقہ دیگر فقہی اُصولوں کے مقابلے میں ممتاز اور سہل ہیں، بایں معنی کہ ہمارے اُصول محض نظری نہیں ہیں، بلکہ تطبیقی ہیں، اصل کے ساتھ فرع بھی توضیح وتطبیق کے طور پر موجود ہوتی ہے، اس تطبیق وتوضیح سے مناسبت وممارست پیدا ہونا درحقیقت کتاب فہمی ہے، اور کتاب پڑھنے کا ایک مقصد ہے، اور ہمارے ہاں اسی تطبیق کی مہارت کو اُصولِ فقہ کی مہارت کہا جاتا ہے، اس تطبیق وتوضیح کے لیے درج ذیل اُمور کا التزام معاون ہوسکتا ہے:

الف:- اصل کو عام فہم انداز میں پہلے بتایا جائے، اس کے بعد بطور مثال کے کتاب میں ذکر کردہ تفریع یا تفریعات ذکر کر دی جائیں، مثلاً: کہا جاتا ہے کہ نصِ قرآنی کے مدلولِ خاص پر خبرِ واحد سے زیادتی کرنا حنفیہ کے ہاں جائز نہیں، جس کی دوسری مناسب تعبیر یہ ہے کہ خبرِ واحد کے ذریعہ نصِ قرآنی سے ثابت شدہ حکم جیسا حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس کی یہ تعبیر بھی کی جاسکتی ہے کہ اثباتِ حکم کے لیے خبرِ واحد کتاب اللہ کے ہم پلہ نہیں ہوسکتی، مثلاً: آیتِ وضو سے وضو کے ارکانِ اربعہ کی فرضیت ثابت ہے، اخبارِ آحاد سے تسمیہ، نیت، موالات، ترتیب اور تیامن ثابت ہوتا ہے، اگر اسے فرض کی مانند کہیں تو خبرِ واحد اور کتاب اللہ کے درجہ میں فرق ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ دونوں ثبوت کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں، جب اصل یہ ہے کہ خبرِ واحد اور کتاب اللہ کے مرتبوں میں تفاوت ہے تو ان سے ثابت ہونے والے احکام میں بھی تفاوت ہونا لازمی ہے، لہٰذا اعضاء وضو سے متعلق کتاب اللہ کا حکم فرض ہوگا، اخبارِ آحاد کا مفاد سنت ہوگا، اگر وضو عبادتِ غیر مقصودہ نہ ہوتی تو واجب بھی کہہ سکتے تھے۔

ب:- اس تطبیقی عمل میں مزید افادیت کے لیے کتاب کی مثالوں سے ہٹ کر بھی مثالیں

بتائی جائیں، تاکہ تطبیق کا یہ عمل کتاب کی تفہیم تک محدود نہ رہے۔ اس کے لیے اُصولِ فقہ کی زیرِ درس کتاب کے علاوہ بقیہ کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے، بالخصوص ماضی قریب کے مؤلفین کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، شیخ ابوزہرہ مصری، شیخ وہبہ زحیلی اور شیخ علی الخفیف رحمہم اللہ کی کتابیں قابلِ استفادہ ہیں، ان کتابوں سے تعبیر کی سہولت کا فائدہ بھی حاصل ہوگا، جب کہ ہماری قدیم کتب میں سے ''**الأشباه والنظائر**'' لابن نجیم اور ''**تقويم الأدلة**'' لأبی زید الدبوسی خوب معاون ہوسکتی ہیں۔

ج:- کتاب کی بعض مثالیں اصل پر بمشکل منطبق ہوتی ہیں، ایسے موقع پر خارجی مثالوں کے ذریعہ اصل سمجھا دیں، اصل اور مثال کے درمیان عدمِ انطباق کی باادب نشاندہی کردی جائے، مثلاً: اصول الشاشی کے درس میں حقیقت ومجاز کی بحث پڑھتے ہوئے حقیقتِ متعذرہ کی مثال آتی ہے: ''**إذا حلف لايأكل من هٰذه الشجرة ... لوحلف من عين الشجرة لايحنث**'' یہاں محلوف علیہ عدمِ اکل ہے، جسے حقیقتِ متعذرہ کی مثال بنایا گیا ہے، حالانکہ عدمِ اکل متعذر نہیں ہے، اکل متعذر ہے۔ اس اصل اور مثال کے درمیان تطبیق میں روایتی تکلف کی بجائے اگر آسان انداز میں یوں کہا جائے: ''**واللّٰه لأكُلَنَّ هٰذاالجبلَ الضخمَ مبتلعًا وإلا عليَّ كذا وكذا**'' تو شاید بات بآسانی سمجھ آجائے، تطبیق وتعبیر کی سہولت کے لیے علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی ''**إرشاد الفحول**'' بھی مفید ہے۔

جب کہ ہمارے استاذِ گرامی حضرت مولانا محمد انور البدخشانی دامت برکاتہم کی تسہیلات وتیسیرات بھی انتہائی مفید ہیں، متعلقہ درسی کتابوں کے مغلق مقامات یا تعبیری دقتوں سے یسر وسہولت کے ساتھ نکلنے کے لیے استاذِ محترم کی کتابوں نے ہمارے جیسے طلبہ اور اچھے اچھے مدرسین کو خوب فائدہ پہنچایا ہے، تیسیر اُصولِ فقہ، تسہیل اصول الشاشی اور تسہیل الحسامی (**التيسير المهذب**) وغیرہ لائقِ استفادہ ہیں۔

۷:......فن کی جو اہم اہم اصطلاحات دورانِ درس سامنے آئیں، انہیں سمجھا کر یاد رکھنے کی تاکید کی جائے، مثلاً: عام، خاص، مطلق، مقید، حقیقت، مجاز۔ پھر جو اصطلاحات متقارب المفہوم ہوں ان کے درمیان وجوہِ فرق کی پہچان بھی کرائی جائے، مثلاً: خاص ومعرفہ اور عام ونکرہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کا لحاظ رکھا جائے، یہ اصطلاحات امتحان میں بھی پوچھی جائیں۔

۸:......تمہیدی گزارشات میں پڑھا کہ اُصولِ فقہ کم از کم پانچ مباحث پر مشتمل فن کا نام ہے، ہماری درسی کتابوں میں ان مباحث سے کتنا تعرض ملتا ہے اور کس حد تک بے التفاتی پائی جاتی ہے، سب سے پہلے مدرس کو اس اہم نکتے سے واقفیت ہونی چاہیے، اس کے بعد طلبہ کے سامنے بھی اس مضمون کو

حسبِ موقع دہرایا جائے، تاکہ ذی استعداد طلبہ کتاب فہمی کے بعد اُصولِ فقہ کے مباحث کی دیگر جہات سے شناسائی کے لیے متوجہ ہوسکیں، مثلاً:

● ''أُصول الشاشی'' میں زیادہ تر حصہ ''دلالۃ الکلام'' سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ ادلۂ شرعیہ میں سے مآ خذِ اصلیہ اتفاقیہ کا بیان تو ہے، لیکن مآ خذِ ذیلیہ اختلافیہ سے مکمل بحث نہیں ہے۔ اسی طرح مقاصدِ احکام و مدارجِ احکام کا پہلو یہاں نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُصول الشاشی کے طالب علم کو ان بھاری مباحث میں اُلجھانا تدریس کے تدریجی ضابطہ کے خلاف ہے تو یہ بات اپنی جگہ معقول ہے، لیکن خود کتاب کی ابتدائی ابحاث بھی تو ابتدائی طالب علم کے لیے کافی دشوار ہیں، جب ان ابحاث سے مناسبت ہوجاتی ہے تو ان ابحاث کے اشارات بھی زیادہ نامانوس نہیں رہیں گے۔

● دوسری کتاب ''نور الأنوار شرح المنار'' للشیخ احمد (ملا جیون) الصدیقیؒ [۱۰۴۸ھ-۱۱۳۰ھ] ہے، اس میں حاکم اور احکامِ شریعت کے مقاصد و مدارج سے تعرض نہیں فرمایا گیا، تقریباً کتاب کا آدھا حصہ اُصولی مباحث میں سے صرف دلالتِ کلام اور اور اس کی تعریفات اور ردوقدح سے تعلق رکھتا ہے۔ فقہ کے ذیلی اصول و ذیلی مآ خذ کا یہاں بھی کوئی اتا پتا نہیں ملتا، البتہ قیاس کے ساتھ استحسان کی بحث قدرے تفصیلی انداز میں مل جاتی ہے۔

● تیسری درسی کتاب ''منتخب حسامی'' ہے، اس کا دائرۂ بحث بھی تقریباً ''نور الأنوار'' والا ہے، ایجاز و اغلاق بھی حل طلب ہے، جس کے حل کے لیے ہمارے جیسے مدرسین کے لیے استاذ بدخشانی مدظلہم کی تسہیل ازبس ضروری ہے، ورنہ استاذ اور طالب علم کا زیادہ تر وقت اُصولِ فقہ اخذ کرنے سے زیادہ حلِ کتاب میں صرف ہوتا رہے گا۔ بہرحال اس کتاب میں یہ خوبیاں بھی ہیں:

الف: مباحث کی ترتیب، بزدوی و سرخسی کی ہے۔

ب: قیاس واستحسان پر یہاں بھی اچھی بحث فرمائی گئی ہے۔

ج: اہلیت وعوارضِ اہلیت کی ابحاث مناسب انداز میں بیان فرمائی گئی ہیں۔

د: ''أُصول الفقه المقارن'' کی ایک جھلک بھی اس کتاب میں ملتی ہے کہ دیگر ائمہ کے ہاں دلالتِ کلام سے متعلق وہ معتبر اصول جن کا حنفیہ کے ہاں اعتبار نہیں ہوتا، ان کو وجوہِ فاسدہ کے عنوان سے بالتفصیل ذکر فرمایا گیا ہے، گوکہ یہ مناظرانہ ابحاث سہی، مگر اُصولِ فقہ کو ان ابحاث سے خالی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

یہ ساری منفرد ابحاث چونکہ حسامی کے آخری حصہ میں ہیں، اس لیے جہاں ممکن ہو حسامی کو

شروع کی بجائے سنت کی بحث سے اختتامِ کتاب تک شاملِ درس رکھا جائے، ابتدائی حصہ میں توانائی صرف کرنے کی بجائے شاید یہ زیادہ مفید ہو۔

● اگلی درسی کتاب ''شرح التلويح على التوضيح لمتن التنقيح ''لسعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی [متوفی: ۷۹۳ھ] '' ہے، جو اپنے توضیحی نقاش اور کلامی رد وقدح کے حوالے سے مشہور ہے، اس کتاب کو تشحیذِ اذہان، ذہنی استعداد اور تحقیقی وتنقیحی ملکہ پیدا کرنے کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ مگر فی زمانہ استعداد کے انحطاط وضعف کی وجہ سے کتاب ہٰذا کی جدلی ابحاث کے بیچ سے اُصول فقہ دریافت کرنے اور محفوظ رکھنے میں کمزور استعداد طلبہ کو کافی دشواری پیش آتی ہے، گو کہ اس درجے کے طلبہ کسی حد تک علمی وذہنی پختگی حاصل کر ہی چکے ہوتے ہیں، اس لیے اس درجہ کے لحاظ سے اُصولِ فقہ کی تدریس کے مقاصد کے حصول کے لیے یہ کیا جاسکتا ہے کہ: اُصولِ فقہ کے حوالے سے ہماری درسی کتب میں صرف حنفی اُصول پڑھائے جاتے ہیں، جب کہ فقہ میں دیگر مذاہب کی آراء بھی موازنہ، مقارنہ اور محاجہ کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں۔ اُصولِ فقہ میں بھی اگر یہ اسلوب اپنایا جائے اور اس اسلوب کی کتاب ''توضیح وتلویح'' کے ساتھ شامل کی جائے تو مناسب ہوگا، مگر درسی کتاب کا انتخاب چونکہ کئی پہلوؤں کی رعایت کا متقاضی ہوتا ہے، اس لیے زیادہ جد کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ توضیح تلویح کا مدرس علامہ شوکانیؒ کی ''إرشادالفحول ''(إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول، محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ الشوکانی الیمنی) اور شیخ ابوزہرہؒ کی ''علم أصول الفقه '' سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف مناسبات میں محاضرے کی صورت میں طلبہ کو مستفید فرمائے۔ بالخصوص اجتہاد اور اس کے متعلقات، اجتہاد، اجتہادِ جدید اور تجدُّد کے بارے میں بتائے، مجتہد کی اہلیت اور اوصاف، اجتہاد کی شروط وقیود وغیرہ کی طرف رہنمائی کی جائے، نیز اجتہاد کے مراحل، تحقیقِ مناط، تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط جیسی گم شدہ اصطلاحات سے طلبہ کو روشناس کرائے۔ (روضۃ الناظر وجنۃ المناظر فی اصول الفقہ علیٰ مذہب الامام احمد بن حنبل، لابن قدامۃ [متوفی: ۶۲۰ھ])

نیز فقہ اسلامی کے ان ذیلی مآخذ سے ضرور متعارف کرایا جائے، جو عموماً نو پیش آمدہ مسائل کے لیے بنیاد سمجھے جاتے ہیں، جیسے: عرف وعادت، سدِ ذرائع، اور مصالحِ مرسلہ وغیرہ کی حقیقت اور ان کا بجا یا بے جا استعمال بتایا جائے۔

اُمید ہے کہ اس ترتیب سے ہمیں اُصولِ فقہ کی تدریس کے مقاصد وفوائد حاصل ہوجائیں گے۔

۹:......اصل اور فرع کے درمیان تطبیق اور ارتباط کو سمجھنے کے لیے استدلال وادلال کا طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، استدلال کے طریق سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ماخذ کے طور پر کتاب میں جو

نص ذکر کی گئی ہے وہ نص بورڈ پر لکھی جائے یا زبانی بتائی جائے، پھر اس نص سے جو مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے اس مسئلے کے استنباط و استنتاج کا طریقہ بتایا جائے، مثلاً:

''وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ'' میں مسح کا حکم ہے، اب کل سر کا مسح ہے، یا بعض کا؟ اس میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی ایک بنیاد لفظ ''ب'' ہے جو ''رُءُوۡسِكُمۡ'' پر داخل ہے، اگر باء کو زائدہ کہیں تو مسح کا حکم پورے سر کو شامل ہوگا، جیسے: مالکیہ کے ہاں اور ''ب'' کو تبعیض کے لیے لیا جائے تو مسح کا وجوبی حکم سر کے بعض حصے کے ساتھ متعلق ہوگا، جیسے جمہور کے ہاں ہے، پھر اس بعض کی اپنی تفصیل ہے، ہم اُصول تک پہنچنے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس دلیل سے فلاں امام نے یہ استدلال کیا ہے، جن کے نتیجے میں ان کے ہاں مسح کا یہ حکم ہے، فلاں امام نے یہ استدلال کیا جس کا یہ نتیجہ نکلا۔

اسی صورت کو اُلٹا کردیں کہ پہلے مسئلہ ذکر کریں، مسئلہ میں جو اقوال ہیں وہ بتائے جائیں، پھر اس فرع اور قول کی بنیاد کے طور پر دلیل اور ماخذ کو ذکر کردیں، یہ ترتیب ایک طرح فقہ کے درس کی وجہ سے ہمارے طلبہ کے لیے زیادہ مانوس ہے، وہ اس طریق سے فقہی اُصول کو جلدی سمجھ پائیں گے۔

تفریع وتذییل

اُصولِ فقہ کی تدریس کے دوران تمہید وتوضیح سے جب فارغ ہو جائیں تو تین اضافی اُمور کی کوشش بھی کی جائے:

۱:- جیسا کہ اوپر بھی بتایا گیا کہ اُصول کی تفہیم کے لیے کتاب کی مثالوں پر اکتفا کی بجائے درسی کتاب کے علاوہ اُصولِ فقہ کی دیگر کتابوں سے مثالیں بھی نکال کر بتائی جائیں، جس کو فروع میں اُصول فقہ کے اجراء کا عنوان بھی دیا جاسکتا ہے۔

۲:- آیات الاحکام منتخب کی جائیں اور ان آیات سے ثابت کیے گئے احکام کے طریقۂ اثبات معلوم کرنے کے لیے فقہی تفاسیر، قرطبی (''الجامع لأحكام القرآن'' ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبیؒ [متوفی: ۶۷۱ھ])، جصاص (''أحكام القرآن'' احمد بن علی ابوبکر الرازی الحنفی [متوفی: ۳۷۰ھ]) اور مظہری (''التفسير المظهري'' قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ [متوفی: ۱۲۲۵ھ]) وغیرہ سے کچھ کچھ مطالعہ کروایا جائے۔ اس محنت کو استدلالی اجراء کا نام دیا جاسکتا ہے۔

۳:- ہر بحث کے اختتام پر مشقی سوالات بنائے جائیں اور ان سوالات کے جوابات سابقہ خواندگی کی روشنی میں طلبہ سے نکلوائے جائیں، اس محنت کے لیے استاذِ محترم مولانا محمد انور بدخشانی زید مجدہم کی ''تسہیل اصول الشاشی'' سے مدد لی جاسکتی ہے۔

ائمہ اربعہ کے اختلاف کے بنیادی اجتہادی اصول

ہمارے سماج میں اختلافات اتنے زیادہ ہیں کہ جہاں اختلاف کا لفظ ساعتوں سے ٹکرایا وہیں نفرتوں کا تعفُّن محسوس کرنے کے لیے ناک پھیلنا یا سکڑنا شروع ہو جاتی ہے، اس لیے ائمہ مجتہدین بالخصوص ائمہ اربعہ کے اختلافِ رائے کی بنیاد بننے والے اصول یا اسباب کی طرف جانے سے قبل نفسِ اختلاف اور علمی و اجتہادی اختلاف کے بارے میں چندگزارشات پیشِ نظر رہنا مفید معلوم ہوتا ہے:

۱:- کسی بھی مسئلہ میں علمی و اجتہادی اختلاف مذموم نہیں، بلکہ محمود و مطلوب ہوتا ہے، کیوں کہ اگر اختلاف کا سبب نص کا احتمالی پہلو ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صاحبِ وحی نے خود اختلاف کی گنجائش دی ہے، مثلاً: ''قُرُوْء'' کے مصداق کی تعیین میں طہر اور حیض کے اختلاف کو مذموم قرار دینے کے بجائے منشأ خداوندی کے قریب یا عین مطابق کہنے کی گنجائش بھی معلوم ہوتی ہے۔

۲:- جب ائمہ کا اختلاف نص کے احتمالی پہلو یا دلائل کے تنوُّع کی بنیاد پر ہو تو ایسے اختلاف کو اختلاف کے بجائے اقوال یا توجیہ سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ حقیقت میں اختلاف ہے ہی نہیں، جیسے: فقہاء حنفیہ کی باہمی اختلافی آراء کو اقوال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شافعیہ کے ہاں ایسی آراء کو ''وجوہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسے اختلاف کے بجائے راہِ وسعت کے اختیار سے تعبیر کرنا چاہیے۔ حضرت طلحہ بن مصرف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے سامنے فقہاء کے اختلاف کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ: ''لا تقولوا: الاختلاف، و لکن قولو: السعة.'' (حلیۃ العلماء، ج:۵، ص:۱۱۹، بحوالہ راہِ عمل، خالد سیف اللہ) یعنی فقہاء کے اختلاف کو اختلاف سے تعبیر کرنے کے بجائے گنجائش سے تعبیر کرو۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایسا ہی منقول ہے کہ انہوں نے فقہاء کے اختلافات کی بابت لکھی گئی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ: ''لا تسمّه کتابَ الاختلاف و لکن سمّه کتابَ السعة'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیہؒ [متوفی: ۷۲۸ھ]، تفسیر سورۂ بقرہ، ج:۱۴، ص:۱۵۹، مجمع الملک فہد) ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ جامعہ کے امتحانات کے سوالیہ پرچوں کی ترتیب کے دوران مختلف الآراء مسائل میں فقہاء و ائمہ کے اختلاف جیسے روایتی لفظ کو بڑے التزام کے ساتھ ''اقوال'' سے تبدیل کروایا کرتے تھے۔ الغرض ائمہ کے اختلافِ رائے کو اختلافات کی بجائے آراء اور اقوال سے تعبیر کرنا ہی قرینِ صواب ہے۔ ائمہ کی آراء کو اختلاف سے تعبیر کرنا ایک گونہ لفظی تسامح کے درجے میں ہے۔

۳:- ائمہ کی آراء کو آپ اقوال کہیں یا اختلاف، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے، اس حقیقت سے گزرتے ہوئے ہمیں علمی و اجتہادی اختلافات کے اصول و آداب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ نیز

جس طرح اختلاف کرنے کے آداب ہیں، اسی طرح ان اختلافات میں استفادے کے اصول وآداب بھی قابلِ لحاظ ہیں۔

یہاں پر بعض لوگ افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ ایک مُفرِّط طبقہ یہ کہتا ہے کہ فقہاء نے دین کو مختلف شناختوں میں تقسیم کر دیا ہے، لہٰذا حنفی شافعی بننے کی بجائے اسلامی اور محمدی بنو۔ حنفی، شافعی کے چکروں میں نہ پڑو۔ یہ تفریط فقہ واجتہاد اور استنباط واستنتاج کے عمل سے لاعلمی و جہالت پر مبنی ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حنفی، شافعی وغیرہ ''دین'' کا نام نہیں ہیں، بلکہ ''منزلِ محمدی'' تک پہنچنے کے لیے مختلف مذاہب (طرق وسبل) کا نام ہیں۔

اس کے برعکس مُفرِط طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذاہبِ اربعہ برحق ہیں، آپ ان مذاہب سے حسبِ منشأ جو لینا چاہیں یہ جائز ہے، حالانکہ خود اربابِ مذاہب اور مذاہب کے شارحین نے اس طرزِ عمل کی سخت تشنیع فرمائی ہے۔ اسے مذموم انتقاء، تتبعِ رُخص اور تلفیق بین المذاہب قرار دیتے ہوئے اتباعِ ہویٰ ٹھہرایا ہے۔

ہاں! اگر ضرورتِ شدیدہ کے تحقُّق کے نتیجہ میں معمول بہٖ مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول یا استفادے کی نوبت آئے تو اس کے اصول، قواعد اور شرائط وآداب کی مکمل پاسداری کے ساتھ گنجائش ہے۔ اس گنجائش سے استفادے کے وقت اختلافِ ائمہ کو وسعتِ شرعی کہہ کر اختیار کرنے والے کو ملامت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ہے وہ اجتہادی اختلاف جسے وسعت اور گنجائش کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی مقلد اس گنجائش کی آڑ لیتے ہوئے مخصوص مقاصد کے لیے شروع سے ہی راحت کوشی اور سہولت طلبی کے لیے مذاہبِ متبوعہ کو چراگاہ سمجھ کر مختلف چراگاہوں میں چرندہ بنتے چلا جائے تو شرعاً وفقہاً قابلِ ملامت ہے، بلکہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول کسی مخصوص ضرورت کے تحت ایسا کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ بات آپ نے تین طلاق کو تین ماننے والے کے حق میں فرمائی ہے جب وہ تین طلاقیں دینے کے بعد ایک شمار کروانے کے لیے تین کو ایک قرار دینے والی رائے کے پیچھے اپنا جرم چھپانے کے درپے ہو جائے۔ (فتاویٰ شیخ الاسلام، کتاب الطلاق)

ائمہ اربعہ کے اجتہادی اُصول

ائمہ اربعہ کے اجتہادی اُصول سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ وہ بنیادیں جن پر فقہی فروعات کا ذخیرہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ بنیادیں تمام مسالک کے ہاں من وجہٍ متحد ہیں، من وجہٍ مختلف ہیں۔ اتفاق واتحاد کا پہلو یہ ہے کہ ہر امام کے ہاں اس بات کا التزام ہے کہ کوئی بھی فرعی مسئلہ کسی دلیل اور بنیاد کے بغیر اپنی طرف سے

بیان نہ کیا جائے۔ اگر کسی بھی شخص نے بلا دلیل اور بے بنیاد کوئی جزئیہ گھڑا اور لوگوں کو اس مسئلہ کی اتباع کی دعوت دی تو یہ شرعاً و اخلاقاً جرم ہے۔ فقہاء کا یہ جملہ معروف ہے کہ: ’’**لا یجوز لأحد أن کان یقول بقولنا حتی یعلم من أین قلنا**‘‘۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، تقلید، حکم التقلید، حکم التقلید فی الفروع، ج:۱۳، ص:۱۶۱)

اب فقہاء کرام کے فقہی قول کا ماخذ کیا ہے؟! اس بارے میں بھی تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے کہ قرآن وسنت، اجماعِ اُمت اور قیاسِ شرعی، یہ اتفاقی مآخذ ہیں۔ ائمہ اربعہ نے اپنے بیشتر فقہی مسائل ان ہی چار چشموں سے حاصل کیے ہیں، اس لیے ان چار بنیادوں پر قائم فروع کسی بھی مسلک کے فقہی ذخیرہ کا حصہ ہوں انہیں اُصولی اختلافی مسائل سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ان مآخذ کی مثال مقررہ پیمانوں کی ہے۔ فقہاء کی مثال ان پیمانوں کے مظروف سے اپنے دامن بھرنے والوں کی ہے، ان پیمانوں سے جس نے جو لیا حکماً وہ سب ایک ہی ہے۔ فرق صرف ظرف کا ہے، مظروف سب کا ایک ہی ذخیرہ سے اُٹھایا ہوا ہے۔

ہاں! اتنا ضرور ہے کہ ان مآخذِ اربعہ سے جو ظروف بھرے گئے ہیں، اُن کی وسعت، حجم اور گنجائش ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہے: کوئی کشادہ اور گہرا ہے (حنفی)۔ کوئی کشادہ دہن ہے، مگر عمق نہیں ہے (مالکی)۔ کسی کا عمق کم ہے، مگر ظاہری وسعت پائی جاتی ہے (شافعی)۔ کسی کا ظرفِ حاوی صرف ظاہری پھیلاؤ رکھتا ہے (حنبلی)۔ ان برتنوں کی ساخت کے اس اختلاف کی بدولت ان کی بھرائی بھی مختلف ہوگی، یہ اختلاف ہے، اس کو اختلاف کہہ سکتے ہیں، اسی اختلاف کو ان کا مآخذِ اتفاقیہ سے استفادے کی نوعیت وکمیت کا اختلاف بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہاں! یہ بات وہاں تک درست ہوگی، جہاں تک اختلاف کی بنیاد اِن دلائل میں سے کسی دلیل کے اختلاف پر مبنی نہ ہو، اگر اختلاف ناشئ عن الدلیل ہو تو اسے استفادے کی نوعیت کا اختلاف کہنے کے بجائے ترجیحِ دلیل واختیارِ دلیل کا اختلاف کہا جائے، جیسے: کفارات میں ’’رقبۃ‘‘ کے ’’مؤمنۃ‘‘ ہونے کی قید کا اختلاف بعض مواقع کے اطلاق وتقیید کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، یا سنت میں نافی اور مثبت کا اختلاف ہے اور دونوں روایتیں قابلِ اعتبار ہیں، تو اس اختلاف کو اختلاف کے بجائے عمل بالدلیل کہنا زیادہ موزوں ہے، اس موقع پر کسی کا رجحان ترجیح ہے اور کسی کا میلان تطبیق وتوفیق کا ہے، لیکن ترکِ سنت کی طرف کوئی نہیں جاتا، جس نے جس روایت کو اختیار کیا اس نے سنت کی حجیت کے اعتقاد کی بنیاد پر ہی اُسے لیا، اسے اختلاف کے بجائے عمل بالسنۃ کہنا چاہیے۔

منصوص اور غیر منصوص مآخذ

مسائل کے دلائل اور مآخذ کے ضمن میں ایک بات یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فقہی دلائل کی معروف ترتیب وتقسیم کے علاوہ ایک اور تقسیم بھی ہے، جسے منصوص دلائل اور غیر منصوص دلائل کی تقسیم

سے پہچانا جاتا ہے، منصوص دلائل سے مراد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، شرائع من قبلنا اور آثارِ صحابہؓ (بالخصوص جو خلافِ قیاس ہوں ان کی حیثیت مرفوع روایت کی ہوتی ہے) ہیں۔ ''آیات الاحکام'' کی تعداد ۲۵۰ سے لے کر ۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ قرطبی اور مظہری میں فقہی ذوق کے تحت تفسیر کی گئی ہے، جس کی وجہ سے آیاتِ احکام کا عدد مخصوص نہیں رہتا۔ اسی طرح ''احادیث الاحکام'' کی تعداد بھی ۵۰۰۰ سے لے کر ۸۰۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ ''الإلمام لأحادیث الأحکام'' ابن دقیق العیدؒ، ''بلوغ المرام من أدلۃ الأحکام'' ابن حجر عسقلانیؒ [۷۷۳ھ-۸۵۲ھ]، اور ''إعلاء السنن'' شیخ ظفر احمد عثمانیؒ، اس موضوع کی معروف ومتداول کتابیں ہیں۔

شرائعِ سابقہ میں سے وہ احکام جو نفیاً یا اثباتاً ہمارے لیے واضح کردیئے گئے ہیں، اُنہیں اپنی شریعت کی وضاحت کے مطابق ترک یا اختیار کرنا خود ہماری شریعت کا عمل کہلائے گا۔ جہاں سابقہ شریعتوں کا کوئی حکم مذکور ہو اور اس کی وضاحت ہماری شریعت میں نہ ہو، احناف اس سکوت کے موقع کو تقریر قرار دیتے ہیں اور اس حکم کے باقی ہونے کے قائل ہیں۔ دوسری رائے امام شافعیؒ وغیرہ کی ہے کہ ایسا حکم زندہ و باقی شمار نہیں کیا جائے گا۔ الغرض اس حجیت کے اختلاف کی وجہ سے اگر ائمہ کے درمیان اختلاف ہو تو اسے دلیل پر مبنی اختلاف کہہ سکتے ہیں، مگر نفس الامر میں اس اختلاف کی مثالیں بالعموم دستیاب نہیں، یہ ایسا اُصولی اختلاف شمار ہوگا جس کی خارج میں فروع کمیاب ہیں۔

آثارِ صحابہؓ کی حجیت مستقل موضوع یا دینی ضرورت ہے، یہاں یہ سمجھنا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے وہ اقوال جن میں بظاہر اجتہاد اور قیاس کا دخل نہیں ہے، ایسے آثار حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں حجت اور دلیل شمار کیے جاتے ہیں، انہیں مرفوع حدیث کے حکم میں سمجھا جاتا ہے۔ ایسے آثار کو جب شخصی اجتہاد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا تو اس کا مرفوع ہونا متعین ہوگا، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی طرف سے شرعی امور میں رائے زنی کرنے والے نہیں تھے، البتہ شافعیہ اور حنابلہ آثارِ صحابہؓ کو فی الجملہ حجت نہیں مانتے۔ بہت سارے اختلافی مسائل آثارِ صحابہؓ کی حجیت کے اعتبار و عدمِ اعتبار کے اصول پر متفرع ہوئے ہیں۔ جنہوں نے نہیں مانا ان کے فروع کم تر رہ گئے۔ اسے فروع کا تفاوت کہیں یا اختلاف کہیں، بہرحال فقہ کی آراء کے تنوُّع کی ایک بڑی وجہ بن گئے۔

غیر منصوص فقہی دلائل

غیر منصوص فقہی ادلہ سے مراد فقہِ اسلامی کی وہ بنیادیں ہیں جو فقہاءِ اُمت کے اتفاق، استنباط اور اجتہاد کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئی ہوں اور ان پر فقہی مسائل کی بنیاد رکھی گئی ہو، ظاہر ہے اجتہاد و استنباط میں فطری تفاوت اور تنوُّع ناقابلِ انکار امر ہے، اسی کے بارے میں ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ کا

ارشاد ہے: ’’**اتفاقهم حجة قاطعة و اختلافهم رحمة واسعة.** ‘‘(المغنی، خطبۃ الکتاب، ج:۱،ص:۲، ط: ادارۃ البحوث العلمیۃ) اتفاق کی مثال اجماع ہے، اجماع کی صورت میں اختلاف ہی نہیں رہا، باقی استنباطی واجتہادی جو بنیادیں ہیں ان پر متفرع ہونے والے مسائل کو اختلافی کہا جاسکتا ہے، اسے اختلاف کہیں یا وسعت، محض تعبیری فرق ہوگا۔ غیر منصوص اجتہادی بنیادیں یہ ہیں:

قیاس	استحسان	مصالحِ مرسلہ	استصحاب
ذریعہ	عرف وعادت	تعاملِ خاص/تعاملِ اخیار	

ان فقہی بنیادوں، اصولوں اور دلیلوں میں سے استحسان اور مصالحِ مرسلہ احناف و مالکیہ کے ہاں حجت ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف اس کے برعکس ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں استصحاب کا اعتبار ہے، سدِ ذریعہ وفتحِ ذریعہ کے بارے میں احناف و مالکیہ حجیت کے قائل ہیں۔ مالکیہ زیادہ توسُّع سے کام لیتے ہیں، عرف وعادت کا سب ہی اعتبار کرتے ہیں، مگر احناف کے ہاں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ کے متوارث عمل کو ترجیح دیتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے اور اہلِ مدینہ کے تعامل کو فوقیت دیتے ہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مولودِ مکہ ہیں تو وہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ کے تعامل کو اہمیت دیتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ چونکہ عمل بالظاہر کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات کو مرغوب جانا جو اُن کے ذوق کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتے تھے، جیسے: حضرت ابوہریرہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم۔ بنابریں جب مسائل کی بنیاد ان اُصولوں پر ہوگی تو فروع کا تنوُّع وتفاوت یقینی طور پر پایا جائے گا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تفصیلِ بالا کی روشنی میں کافی حد تک یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ائمہ کے اقوال اور آراء کے تنوُّع کا بنیادی سبب دو اُمور کو قرار دیا جاسکتا ہے: ایک اتفاقی ماخذ سے استفادے کی نوعیت کا اختلاف، دوسرا سبب ذیلی ماخذ کا اعتبار اور عدمِ اعتبار ہے۔ اس کے بعد اجتہادی اصول کی انفرادی تفصیل کی حاجت تو نہیں ہے، البتہ اختصار کے ساتھ عرض کردیتے ہیں، ممکن ہے کسی طالب علم کے لیے ضبط میں معاون ثابت ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی واستنباطی اصول

- امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ارشاد ہے کہ میں قرآن کریم سے مسئلہ کا حکم دریافت کرتا ہوں، اگر قرآن میں نہ ملے تو سنتِ رسول اللہ (ﷺ) سے لیتا ہوں، اگر سنت میں نہ ملے تو اقوالِ صحابہؓ

کی طرف جاتا ہوں، اس کے بعد کسی کے قول کی طرف نہیں جاتا۔ ابراہیم نخعیؒ، ابن سیرینؒ، ابن مسیّبؒ اور عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کو لینے کے بجائے ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد میں قیاسِ جلی اور قیاسِ خفی (استحسان) دونوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

● دلائل کے درمیان درجہ بندی کا لحاظ بھی آپ کا خاص وصف تھا۔ اخبارِ آحاد کو کتاب اللہ کے بعد رکھتے تھے، جس سے بعض ظاہر بینوں کو مغالطہ لگتا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیاس کے لیے اخبارِ صحیحہ کو ترک کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ ترکِ قیاس کی وجہ سے نہیں، بلکہ کتاب اللہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

● امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ متعارض ومتفاوت روایات کے درمیان ترجیح کے بجائے تطبیق وتوفیق کو اہمیت دیتے ہیں۔ ترجیح میں ایک روایت کا ترک لازم آتا ہے اور تطبیق میں ہر ایک روایت کو معمول بنانے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

● امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اخبار کے قبول وترک کرنے کے لیے ۱۶ اُصول وشرائط منقول ہیں، ان کی وجہ سے بہت سارے احکام امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اخبار سے ثابت نہیں ہو سکے اور دیگر ائمہ کے ہاں ثابت ٹھہرے، اس لیے اُصولِ روایت اور اُصولِ درایت کی بنا پر وہ طرقِ اجتہاد سامنے آئے جو دیگر ائمہ کے نہیں تھے۔ اس کی تفصیل علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے اس تقدیمی مقالہ میں دیکھی جاسکتی ہے جو آپ نے ''نصب الراية'' کے لیے لکھا تھا اور ''فقه أهل العراق و حديثهم'' (ص:۲۷، ط: ایچ. ایم. سعید کراچی) کے نام سے مستقل طور پر بھی مطبوع ہے۔

● نیز تعامل کے باب میں امام صاحبؒ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور اہلِ کوفہ کے تعامل کو ترجیح دیتے ہیں۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اصول

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی اُصول ہیں:

۱:-کتاب اللہ ۲:-سنتِ رسول (ﷺ) ۳:-تعاملِ اہلِ مدینہ

البتہ سنت اور تعاملِ اہلِ مدینہ میں اس تفصیل کے ساتھ اجتہاد فرماتے ہیں کہ سنت میں متصل روایات کو اولین ترجیح دی جاتی ہے، پھر مراسیل کو لیتے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قضایا، پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ، پھر مدنی صحابہؓ کے فتاویٰ، اس کے بعد مدینہ کے فقہاءِ سبعہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ اور قضایا کو اہمیت دیتے ہیں۔ (الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف، ص:۶۷، ط: دار الکتب، بیروت)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول

دیگر ائمہ کے مقابلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصولِ اجتہاد زیادہ منضبط ہیں، انہوں نے اپنے

اُصول وفروع خود مرتب فرمائے ہیں، ان کے اصول کی کتاب ’’الرسالۃ‘‘ معروف ہے۔ آپ کے ہاں بھی تین اُصول بنیادی ہیں:

۱:-استمداد من الکتاب ۲:-استخراج من السنۃ/عمل بالسنۃ ۳:-تعاملِ اہلِ مکہ

سنت اور حدیث کے ظاہری مدلول پر عمل کے لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حریص تھے، آپ سنت کو قرآن کی شرح اور بیان قرار دیتے تھے، جیسے اصول فقہ میں ملتا ہے کہ آپ موقع بہ موقع سنت/ اخبار آحاد کو قرآن کریم کے الفاظ کے معانی قرار دیتے تھے، جو حنفیہ کے نزدیک بسا اوقات اخبار آحاد اور کتاب اللہ کے درمیان مساوات پر منتہی ومنتج ہوجاتا تھا، جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ آپ نے اخبارآحاد کی حجیت پر اتنا زور دیا ہے کہ انہیں عملاً متواتر کے قریب قرار دیا تھا۔ (الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف، ص:۳۷، ط: دارالکتب، بیروت)

نیز مراسیل کے حجت ہونے کے بارے میں آپ کے اقوال مضطرب رہے۔ بالآخر سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات کی مراسیل کو حجت ماننے پر مجبور ہوگئے۔ (فقہ اہل العراق وحدیثہم، ص:۳۳، ط: سعید)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول پانچ شمار کیے جاتے ہیں:

۱:- ظاہر نصوص۔

۲:-صحابہ رضی اللہ عنہم کے اتفاقی فتاویٰ یا جن کا خلاف منقول نہ ہو۔

۳:- اختلافِ صحابہؓ کی صورت میں جو فتویٰ قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہو۔

۴:- اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صریح فتویٰ نہ مل سکے تو حدیثِ مرسل نیز ضعیف حدیث کو بھی لے لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ شدید الضعف ومنکر نہ ہو۔

۵:- جب کوئی نص اور سلف کا قول نہ ملے تو پھر قیاس سے کام لیتے ہیں، لیکن ایسا بامرِ مجبوری ہی کرتے ہیں، جہاں نص یا قولِ سلف نہ ملے وہاں زیادہ تر سکوت اختیار فرماتے ہیں، رائے سے اجتناب فرماتے ہیں۔ (اعلام الموقعین، ج:۱،ص:۲۳، ط: دارالحدیث)

یہ چند اشارات تھے جو اپنے مبیَّنہ عنوان سے متعلق درج کردیئے گئے ہیں، باقی فقہ، اُصولِ فقہ کی تدریس اور ائمہ کے اجتہادی اُصول کی بابت اسلاف کے بحورِ علمیہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آئندہ نسلوں کو ان ذخائرِ علمیہ سے استفادے کی توفیق دے۔ آمین (انتہیٰ)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....